

شادی شدہ خاتون کا حق ملکیت: سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ

A Married Woman's Right to Own Property: An Important Judgement of the Supreme Court

ڈاکٹر سعدیہ تبسم¹

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد²

Abstract

Islamic law has prescribed the right of dower for women, but unfortunately many people in Pakistan do not give this due right to their wives and create various devices to avoid the payment of dower. Similarly, many women, particularly married women, are deprived of exercising their right to own and dispose of property. Even some judgments of the superior judiciary, under the influence of the principles of English law, treated married women as subservient to their husbands in matter pertaining to ownership of property. In this backdrop, the recent judgment of the Supreme Court of Pakistan in Fawad Ishaq v Mehreen Mansoor, PLD 2020 SC 269, is a welcome change. The judgment which has been written by Honorable Justice Qazi Faez Isa on which Honorable Justice Sardar Tariq Masood concurred, relies on various Qur'anic verses and Prophetic traditions in highlighting the errors in the way some judges treated this issue and, thus, re-establishing for married women the right to own property with all its necessary corollaries. The judgment enunciates the legal principle that "Shariah, including the rights it grants women, was made unassailable by virtue of Article 227 of the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan". The present article analyzes some significant aspects of this judgment.

Key Words: Islamic Injunctions, Property Rights, Dower-

شریعت نے خاتون کے لیے حق مہر اس کے شوہر پر عائد کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بہت سختی سے اس حق کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں نکاح کے وقت نکاح نامے میں مہر کے طور پر تو بہت کچھ لکھا جاتا ہے لیکن ادائیگی کے معاملے میں ٹال مٹول سے کام لیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ایک غلط دستوریہ رائج ہو گیا ہے کہ حق مہر کے طور پر ایسی جائیداد لکھی جاتی ہے جو شوہر کے بجائے کسی اور، بالعموم والدین میں کسی، کی ملکیت ہوتی ہے۔

¹ اسسٹنٹ پروفیسر قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد (sadia.tabassum@iiu.edu.pk)

² ایسوسی ایٹ پروفیسر قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد (mushtaqahmad@iiu.edu.pk)

گویا اولاد نے فرض کیا ہوتا ہے کہ والدین پر ہی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اولاد کی جانب سے حق مہر کی ادائیگی کا بھی بندوبست کریں! اکثر اوقات اس رواج کی بنا پر مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک سنگین مسئلہ پچھلے دنوں سپریم کورٹ میں ایک مقدمے میں سامنے آیا۔³ اس مقدمے کی سماعت سپریم کورٹ کے دور کئی بیچنے کی جس کی سربراہی جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب کر رہے تھے اور انھوں نے ہی فیصلہ لکھا جس سے بیچ کے دوسرے رکن جسٹس سردار طارق مسعود صاحب نے اتفاق کیا۔ جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے حسب سابق اپنے فیصلے کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی اور یوں وہ ایک بہت بڑے ظلم کا راستہ روکنے میں کامیاب ہوئے۔ اس مضمون میں اس فیصلے کے اہم نکات پر تبصرہ پیش کیا جائے گا۔

کیس کے حقائق

پہلے اس کیس کے حقائق مختصر آپش کیے جاتے ہیں:

مہرین اور منصور نے ۱۵ مئی ۱۹۹۵ء کو شادی کی اور نکاح نامے میں پانچ لاکھ روپے، ۷۵ تونے طلائی زیورات اور ایک کنال مکان کو مہر کے طور پر لکھا گیا۔ زیورات کے متعلق تو تصریح کی گئی کہ "حاضر ہیں" لیکن مکان کے متعلق لکھا گیا کہ ۲۸ آبدارہ ٹاؤن، پشاور، میں بنا کر دیا جائے گا۔⁴ منصور شادی کے وقت ملک سے باہر زیر تعلیم تھا اور شادی کے بعد بیوی سمیت باہر ہی سیٹل ہو گیا۔ سپریم کورٹ میں منصور کے وکیل نے بتایا کہ دونوں میاں بیوی کینیڈا میں ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب دونوں آپس میں خوش ہیں تو پھر مقدمہ کیوں قائم ہوا اور پھر یہ مقدمہ سپریم کورٹ تک کیسے پہنچا؟

مقدمہ یوں شروع ہوا کہ شادی کے سولہ سال بعد ۳۰ جون ۲۰۱۱ء کو مہرین نے پشاور میں فیملی کورٹ میں اپنے سسر، حاجی محمد اسحاق جان، اور ساس، مسماہ خورشید اسحاق، کے خلاف مقدمہ دائر کیا جس میں اس نے پلاٹ نمبر ۲۸، آبدارہ ٹاؤن، پشاور پر تعمیر شدہ مکان، یا اس کی مالیت مبلغ ۳ کروڑ ۳۰ لاکھ کے حصول کے لیے دعویٰ کیا۔

فیملی جج نے ۳ مئی ۲۰۱۴ء کو اس کے حق میں ڈگری جاری کر دی۔ اسحاق جان اور خورشید اسحاق نے ڈسٹرکٹ جج کو اس ڈگری کے خلاف الگ الگ اپیل کی۔ ڈسٹرکٹ جج نے ۱۵ فروری ۲۰۱۷ء کو یہ دونوں اپیلیں خارج کر دیں۔ اس دوران میں چونکہ اسحاق جان کا انتقال ہو چکا تھا تو اس کے ورثا کے طور پر اس کے دو بیٹوں اور بیٹی نے اس کی جانب سے اور خورشید اسحاق نے الگ سے پشاور ہائی کورٹ میں ریٹیشنز دائر کر دیں جس نے ۱۸ ستمبر ۲۰۱۸ء کو یہ ریٹیشنز بھی خارج کر دیں۔⁵ دوسری اپیل کے بعد بظاہر قانونی راستہ ختم ہو جاتا ہے لیکن آخری امکان یہ رہتا ہے کہ سپریم کورٹ سے درخواست کی جائے کہ وہ اسے اپیل کی اجازت دے۔ اگر سپریم کورٹ یہ سمجھتی ہے کہ مقدمے میں کوئی اہم قانونی سوال ہے جس کا فیصلہ ضروری ہے تو وہ اپیل کی

³۔ فواد اسحق بنام مسماہ مہرین منصور، PLD 2020 SC 269۔

⁴۔ رقم کے متعلق تصریح نہیں کی گئی کہ وہ ادا کی گئی یا نہیں لیکن عام طور پر رواج یہ ہے کہ زیورات کو تو مہر معجل مانا جاتا ہے اور رقم کو مہر مؤجل قرار دیا جاتا ہے اور فرض یہ کیا جاتا ہے، بلکہ بعض اوقات کا بین نامہ میں لکھا بھی جاتا ہے، کہ یہ رقم بصورت ناچاقی یا علیحدگی ادا کی جائے گی۔

⁵۔ فواد اسحاق بنام مہرین منصور، W.P. No. 2037/P-2017۔

اجازت دے دیتی ہے۔ چنانچہ دو الگ درخواستیں سپریم کورٹ میں دائر کی گئیں۔ سپریم کورٹ کے دور کئی بچنے ۷ فروری ۲۰۲۰ء کو ان درخواستوں کی سماعت کی اور پھر ان پر فیصلہ سنایا۔

مقدمے کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ مہرین کے لیے مہر کے طور پر جو مکان لکھا گیا اور جس کے حصول کے لیے اس نے دعویٰ دائر کیا تھا، وہ ۱۹۶۴ء سے اس کی ساس مسماۃ خورشید اسحاق کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔

دلائل کا خلاصہ

محمد اسحاق جان کے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے وکیل کی جانب سے ایک اعتراض یہ اٹھایا گیا کہ مہرین نے مقدمے میں اپنے سسر اور ساس کو فریق بنایا جبکہ اپنے شوہر کو فریق نہیں بنایا جس کو فریق بنایا جانا ضروری تھا کیونکہ مہر تو اس نے شوہر سے ہی طلب کرنا تھا۔⁶ مزید یہ کہ شوہر کو فریق نہ بنانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ میاں بیوی آپس میں ملے ہوئے ہیں اور بیوی اپنے شوہر کو ذمہ دار ٹھہرائے بغیر اپنے ساس اور سسر سے مکان ہتھیانا چاہتی ہے۔ دوسرا اعتراض یہ پیش کیا گیا کہ اسلامی قانون کی رو سے مہر کی ادائیگی کے لیے شوہر کے والد کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا اور یہ بات انگریزوں کے دور میں بھی عدالت تسلیم کر چکی ہے۔⁷

مہرین کی ساس مسماۃ خورشید اسحاق کے وکیل نے اعتراض کیا کہ مذکورہ جائیداد یکم جون ۱۹۶۴ء کو مسماۃ خورشید اسحاق کے نام رجسٹر کی گئی ہے اور یہ کہ مسماۃ خورشید اسحاق تو اس نکاح نامے میں سرے سے فریق ہی نہیں ہے، نہ ہی اس نے اپنے شوہر اسحاق جان کو اس جائیداد کے متعلق کوئی مختار نامہ دیا تھا۔

ان اعتراضات کے جواب میں مہرین کی وکیل کی جانب سے کہا گیا کہ اس نے شوہر کو اس لیے فریق نہیں بنایا کہ اس کے سسر نے الگ دستاویز پر تصدیق کی تھی کہ نکاح نامے میں مہر کے طور پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ درست ہے اور اس میں مذکورہ جائیداد بھی شامل ہے۔ نیز اسحاق جان اس جائیداد پر مسماۃ خورشید اسحاق کی صریح یا ضمنی اجازت کی رو سے مالکانہ تصرف کرتا تھا اور قانون ایسے ostensible owner کی جانب سے انتقال کو ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ کی دفعہ ۴۱ کے تحت نافذ تصور کرتا ہے۔ مزید یہ کہ لاہور ہائی کورٹ ۲۰۱۰ء میں محمد انور خان بنام صبیحہ خانم میں قرار دے چکی ہے کہ شوہر کی جانب سے اگر یہ وعدہ کیا گیا کہ وہ اپنے باپ کی ملکیتی جائیداد اپنی بیوی کو منتقل کرے گا تو یہ ایسا وعدہ ہے جس کا پورا کرنا اس کے باپ پر لازم ہے۔⁸

منصور کے وکیل کی جانب سے بھی اس بات کے حق میں دلیل دی گئی کہ مہرین نے اسے کیوں فریق نہیں بنایا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ مہرین کا دعویٰ مکان کے حصول کے لیے تھا اور یہ دعویٰ مسماۃ خورشید اور اس کے شوہر کے خلاف تھا۔ چنانچہ مہرین کا اپنے شوہر کو فریق بنانا ضروری نہیں تھا۔ مزید اس

⁶ اسے تکلیفی طور پر Non-joinder کہا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: مجموعہ ضابطہ سو یوانی، ۱۹۰۸ء، آرڈر ۱۔

⁷ اس ضمن میں الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کا حوالہ دیا گیا ہے: محمد صدیق بنام شہاب الدین AIR 1923 Allahabad 364

⁸ PLD 2010 Lahore 119

نے یہ کہا کہ منصور کے والدین کو وہ وعدہ پورا کرنا چاہیے جو انھوں نے منصور کی شادی کے وقت کیا تھا۔ منصور کی جانب سے ایک ڈیکلیریشن بھی دی گئی جس میں قرار دیا گیا تھا کہ اس کے والد نے نکاح نامے پر لکھا تھا کہ مذکورہ پلاٹ پر بہو کے لیے مکان تعمیر کیا جائے گا۔

مہرین اور منصور کے دلائل کا تجزیہ

جسٹس فائز عیسیٰ نے فیصلے کی بنیاد اس اہم حقیقت پر رکھی ہے کہ مذکورہ جائیداد کی ملکیت مسماۃ خورشید اسحاق کی ہے اور وہ ۱۹۶۴ء سے اس کی مالکہ ہے۔ یہ حقیقت فریقین کے نزدیک تسلیم شدہ تھی۔ اس حقیقت پر بنا کرتے ہوئے جسٹس صاحب نے واضح کیا کہ نہ ہی مسماۃ خورشید اسحاق نے نکاح نامے پر دستخط کیے ہیں، نہ کسی اور ایسی دستاویز پر جس میں مکان بنانے سے قبل یا بعد مذکورہ جائیداد مہرین کو دینے کا اقرار کیا گیا ہو۔⁹ مزید یہ کہ مسماۃ خورشید کی جانب سے اس ضمن میں اسحاق جان کو کوئی مختار نامہ بھی نہیں دیا گیا جس کی رو سے اسحاق جان کو اختیار ہوتا کہ وہ یہ جائیداد کسی اور کو منتقل کرتا۔¹⁰

منصور کی جانب سے اپنے والد کے جس اقرار کا ذکر کیا گیا، جسٹس صاحب نے اسے بھی بے فائدہ قرار دیا کیونکہ وہ اقرار جس کی جانب سے تھا، وہ مذکورہ جائیداد کا مالک نہیں تھا، اور جو اس جائیداد کی مالکہ ہے اس کی جانب سے ایسا کوئی اقرار کیا نہیں گیا۔¹¹

جس مقدمے میں لاہور ہائی کورٹ نے قرار دیا تھا کہ سرپر لازم ہے کہ وہ اپنی بہو کو جائیداد کا وہ حصہ منتقل کر دے جو اس کے نام مہرین لکھا گیا ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے جسٹس صاحب نے قرار دیا کہ مذکورہ مقدمے کے حقائق میں سرپر کی جانب سے اقرار موجود تھا کہ وہ یہ حصہ منتقل کرے گا اور وہ خود اس حصے کا مالک تھا، جبکہ موجودہ مقدمے میں جائیداد کی ملکیت سرپر کے پاس نہیں ہے اور اس لیے اس کے اقرار کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔¹²

اسی طرح جسٹس صاحب نے واضح کیا کہ ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ کی دفعہ ۴۱ سے بھی استدلال غلط ہے کیونکہ مذکورہ دفعہ میں موجود شرائط موجودہ مقدمے میں پوری نہیں ہوتیں اور اس وجہ سے یہ نہیں مانا جاسکتا کہ اسحاق جان کو ostensible owner، بظاہر مالک، کی حیثیت حاصل تھی، نہ ہی اس کی جانب سے منتقلی کو نافذ مانا جاسکتا ہے۔¹³

9- فواد اسحق بنام مسماۃ مہرین منصور، PLD 2020 SC 269، پیرا ۱۔

10- ایضاً۔

11- ایضاً۔

12- ایضاً۔

13- ایضاً، پیرا ۸۔

پشاور ہائی کورٹ کے دلائل کا تجزیہ

اس کے بعد جسٹس فائز عیسیٰ نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ پشاور ہائی کورٹ کے فاضل جج کے لیے یہ بات واضح تھی کہ مذکورہ جائیداد کی ملکیت مسماۃ خورشید اسحاق کے پاس تھی، نہ کہ اسحاق جان کے پاس، لیکن اس کے باوجود اس نے قرار دیا کہ قانوناً مسماۃ خورشید اسحاق اس جائیداد سے محروم ہو چکی۔ اس پوزیشن کے حق میں فاضل جج نے تین دلائل دیے ہیں:

ایک یہ کہ مسماۃ خورشید کے دیگر دو بیٹوں کی بیویوں میں سے ہر ایک کو دو کنال جائیداد دی گئی؛

دوسری یہ کہ مسماۃ خورشید نے نکاح نامے پر اعتراض نہیں کیا؛ اور

تیسری یہ کہ مسماۃ خورشید کا شوہر اس جائیداد کے لیے ضامن تھا۔¹⁴

جسٹس فائز عیسیٰ نے واضح کیا کہ ان تینوں دلائل میں کوئی بھی دلیل ایسی نہیں ہے جو قانون کی نظر میں وزن رکھتی ہو۔

پہلی دلیل کے متعلق انھوں نے قرار دیا کہ ہر شادی الگ عقد کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر عقد کی اپنی الگ شرائط ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ دلیل کوئی وزن نہیں رکھتی کہ دو بیٹوں کی بیویوں کو یہ کچھ دیا گیا تو تیسرے بیٹے کی بیوی کو بھی یہ کچھ دینا چاہیے۔¹⁵

دوسری دلیل مسترد کرتے ہوئے جسٹس فائز عیسیٰ نے واضح کیا کہ مسماۃ خورشید اسحاق پر یہ لازم نہیں تھا کہ وہ نکاح نامے کے خلاف عدالت میں جاتی کیونکہ نکاح مہرین اور منصور کے درمیان ہوا جو عاقل بالغ افراد تھے اور انھوں نے آپس میں جو بھی شرائط طے کیں وہ ایک طرفہ طور پر مسماۃ خورشید اسحاق پر اس کی مرضی کے بغیر نافذ نہیں کی جاسکتی تھیں۔ چنانچہ نکاح نامے سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ مزید یہ کہ مہر ادا کرنا تو منصور کی ذمہ داری تھی اور ہے۔ اگر مہرین کا دعویٰ یہ ہے کہ مسماۃ خورشید اپنی جائیداد دینے پر راضی تھی تو اس کا بار ثبوت مہرین ہی پر تھا لیکن وہ یہ ثابت نہیں کر سکی۔¹⁶

تیسری دلیل کو بھی جسٹس صاحب نے مسترد کرتے ہوئے تصریح کی کہ شوہر کا بیوی کی جائیداد پر کوئی ملکیتی حق نہیں ہے، نہ ہی وہ اس جائیداد پر کوئی قانونی ذمہ داری عائد کر سکتا ہے جب تک بیوی اس پر راضی نہ ہو۔ چنانچہ شوہر کا بیوی کی جائیداد کے لیے ضامن ہونا قانون کی نظر میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔¹⁷

یہاں سے جسٹس صاحب نے بحث کو ایک نہایت اہم نکتے کی طرف موڑا ہے جو ہمارے نزدیک سارے مسائل کی جڑ ہے۔

¹⁴ ایضاً، پیر ۹۱۔

¹⁵ ایضاً۔

¹⁶ ایضاً۔

¹⁷ ایضاً۔

مسئلے کی جڑ انگریزی و امریکی قانون کے مفروضات میں ہے۔

جسٹس فائز عیسیٰ نے یہاں خصوصی طور پر اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ مسماۃ خورشید اسحاق کی ملکیتی زمین کے متعلق اس کے شوہر اسحاق جان کے اقرار کو ماتحت تینوں عدالتوں نے اس وجہ سے کافی سمجھا کہ ہمارے جج صاحبان کے ذہن میں بھی بعض اوقات انگریزی و امریکی قانون کے تصورات سرایت کر جاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ہمارے جج صاحبان کو درپیش ایک اہم مسئلے کی تنقیح کے لیے یہ جملہ بہت اہم ہے اور اس وجہ سے ہم اصل جملہ یہاں نقل کرنا چاہیں گے:

We however find that the old European and American concepts at times permeate into the thinking even of judges in Pakistan.¹⁸

انگریزی قانون کا مفروضہ یہ تھا کہ شادی شدہ خاتون اور اس کا شوہر قانون کی نظر میں ایک شخص کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ کہ بیوی اپنے شوہر سے الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اسے coverture کہتے تھے۔¹⁹ اسی مفروضے کے نتیجے میں قانونی طور پر یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ جب تک شادی برقرار ہے، شادی شدہ عورت کا اپنے مال پر کوئی اختیار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس کے مال اور جائیداد پر سارا اختیار شوہر کا ہی ہوتا تھا۔ جسٹس صاحب نے اس ظلم کے خلاف جدوجہد کی تاریخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بعض اہم اقوال اور اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔²⁰ جسٹس صاحب نے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ امریکا میں ۱۹۶۰ء تک اور برطانیہ میں ۱۹۷۵ء تک شادی شدہ خاتون اپنے شوہر کی مرضی کے بغیر بینک اکاؤنٹ تک نہیں کھول سکتی تھی۔²¹

اسلام نے چودہ سو سال قبل عورت کو حق ملکیت دیا ہے۔

اس کے بعد جسٹس صاحب نے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اسلام نے چودہ سو سال قبل عورت کو نہ صرف حق ملکیت، بلکہ اسے اپنے مال و جائیداد پر مالکانہ تصرف کا پورا اختیار دیا ہے۔²² مزید یہ کہ اس نے مالک کی مرضی کے بغیر اس کے مال میں تصرف کو ناجائز قرار دیا۔²³ اس ضمن میں جسٹس صاحب نے نہ صرف بعض قرآنی آیات کا حوالہ دیا ہے، جیسے: ﴿لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ﴾؛²⁴ اور ﴿لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾؛²⁵ بلکہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی تجارت اور اسلام کے لیے آپ کی مالی قربانیوں کی مثال بھی دی ہے۔²⁶ نیز اسلامی

18- ایضاً، پیرا ۱۰۱۔

19- ایضاً، پیرا ۱۰۱۔

20- ایضاً، پیرا ۱۱۱۔

21- ایضاً، پیرا ۱۲۱۔

22- ایضاً، پیرا ۱۳۱۔

23- ایضاً۔

24- القرآن، ۴: ۳۲۔

25- القرآن، ۴: ۲۹۔

26- فواد اسحاق بنام مسماۃ مہرین منصور، PLD 2020 SC 269، پیرا ۱۲۱۔

معاشرے میں عورت کے شرف اور مقام کی مثال کے طور پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی مثال دی ہے۔²⁷ اسی طرح انھوں نے توجہ دلائی ہے کہ اسلام نے عورت کو میراث میں حق دیا اور اس حق کے ذریعے اسے حاصل ہونے والا مال اسی کا ہوتا ہے جس پر اس کے شوہر، والد یا بھائی کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔²⁸ اسی طرح عورت کو مال پر ملکیت کے حصول کے لیے کسی کی اجازت کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ نیز شادی کی صورت میں اسے ملنے والے مہر اور تحائف کی ملکیت بھی اسی کے پاس ہوتی ہے،²⁹ جبکہ پچھلی صدی تک امریکا و برطانیہ میں حالت یہ تھی کہ شادی کے بعد عورت کے مال پر اس کا اختیار ختم ہو جاتا اور اس پر سارا اختیار اس کے شوہر کو حاصل ہو جاتا۔

شریعت کے مقرر کردہ حقوق ناقابل تردید ہیں!

اس کے بعد جسٹس فائز عیسیٰ نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ برصغیر پر برطانیہ کے تسلط نے مسلمانوں کے اپنے ماضی سے ربط کو متاثر تو کیا لیکن شریعت کے ساتھ ان کے تعلق کو ختم نہیں کیا۔ اس دور میں خواتین کو شریعت کی دی گئی حیثیت کی بحالی کے لیے ایک اہم قانون "مسلم تنسیخ نکاح کا قانون ۱۹۳۹ء" کے عنوان سے نافذ کیا گیا۔ اس قانون میں ان اسباب کا ذکر کیا گیا جن کی بنا پر کوئی خاتون عدالت میں فسخ نکاح کے لیے آسکتی ہے۔ فسخ نکاح کے ان اسباب میں ایک سبب "ظلم" کے عنوان سے ذکر کیا گیا اور اس کی ایک صورت یہ بتائی گئی کہ شوہر بیوی کے مال میں اس کی مرضی کے بغیر تصرف کرے، یا اسے اس مال پر قانونی تصرف سے روکے۔³⁰ جسٹس صاحب نے قرار دیا کہ یہ مفروضہ کہ اسحاق جان اپنی بیوی مسماۃ خورشید اسحاق کی جائیداد کو کسی اور کی طرف منتقل کر سکتا تھا، مذکورہ قانون کی رو سے ظلم کی تعریف میں آتا ہے۔³¹ اس کے بعد جسٹس صاحب نے وہ اصول ذکر کیا ہے جو ہمارے نزدیک اس فیصلے کا اہم ترین اصول ہے اور اس لیے ہم یہاں بھی اصل الفاظ نقل کرنا چاہیں گے:

*Shariah, including the rights it grants women, was made unassailable by virtue of Article 227 of the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan, which specifically stipulates that all existing laws are to conform to the injunctions of Islam as laid down in the Holy Qur'an and Sunnah.*³²

(دستور کی دفعہ ۲۲۷ کی رو سے، جس نے خصوصی طور پر تصریح کی ہے کہ تمام موجودہ قوانین کا قرآن و سنت میں مذکور احکام اسلام کے مطابق ہونا لازمی ہے، شریعت، بشمول ان حقوق کے جو اس نے خواتین کو دیے ہیں، ناقابل تردید ہے۔)

27- ایضاً۔

28- ایضاً۔

29- ایضاً۔

30- مسلم تنسیخ نکاح کا قانون، ۱۹۳۹ء، دفعہ ۲(۸)(د)۔

31- فواد اسحق بنام مسماۃ مہرین منصور، PLD 2020 SC 269، پیرا ۱۲۱۔

32- ایضاً۔

اس اصول پر بنا کرتے ہوئے جسٹس صاحب نے آگے مزید کہا ہے کہ دستور میں مال کی ملکیت اور اس سے متعلق تصرفات کو بنیادی حقوق میں شمار کیا گیا ہے اور اس ضمن میں مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔³³ اس لیے شادی شدہ خاتون خود کسی کو اپنا مال ہبہ، بیع یا کسی اور طریقے سے منتقل کرے تو وہ الگ بات ہے، لیکن اس کی مرضی کے بغیر اس کا شوہر یا کوئی اور رشتہ دار اس پر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

فیصلہ

جسٹس صاحب نے آگے یہ تصریح بھی کی ہے کہ مہرین کا حق مہر ثابت شدہ ہے لیکن اسے یہ حق اپنے شوہر کے خلاف دستیاب ہے اور اگر اس نے پہلے اپنے شوہر سے اس کا مطالبہ نہیں کیا، نہ ہی اسے مقدمے میں فریق بنایا، تب بھی اس کا یہ حق قائم ہے اور وہ اب بھی اس کا مطالبہ اپنے شوہر سے کر سکتی ہے۔³⁴ اس کے بعد جسٹس صاحب نے بحث سمیٹتے ہوئے ایپل کی درخواستوں کو ایپل میں تبدیل کیا اور درخواست گزاروں (اسحاق جان اور مسماہ خورشید اسحاق) کے حق میں فیصلہ سنایا، نیز ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کی ترمیم کرتے ہوئے مہرین کا دعویٰ خارج کر دیا۔

قوانین کی اسلامائزیشن: دو اہم نکات

آخر میں اس فیصلے کے تناظر میں پاکستان کے قانونی نظام کے متعلق ہم دو اہم نکات ذکر کرنا چاہیں گے۔

اولاً: برطانوی راج میں مسلمانوں کا عائلی قانون

برطانوی راج سے قبل برصغیر میں خاندانی امور سمیت تمام تنازعات کا فیصلہ قاضی اسلامی قانون کی رو سے کرتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے تسلط جمانا شروع کیا تو ان کے زیر تسلط علاقوں میں قانونی نظام کی تبدیلی کئی مراحل میں طے پائی۔³⁵

ابتدا میں انگریزوں نے یہ اصول طے کیا تھا کہ مذہبی تنازعات کی طرح خاندانی امور۔ جیسے نکاح، طلاق و میراث وغیرہ۔ جیسے امور میں وہ مداخلت نہیں کریں گے۔ تاہم دوسرے مرحلے میں انھوں نے مسلمانوں کے قاضیوں کو ختم کر کے انگریز جج تعینات کر دیے اور چونکہ انھیں مسلمانوں کے قانون کا کچھ علم نہیں تھا، اس لیے ان کی معاونت کے لیے مفتیوں کا تقرر کیا گیا۔ تیسرے مرحلے میں انھوں نے ان کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کروایا جہاں سے مسلمان مفتی بالعموم فتویٰ کے لیے جزیئہ نکالتے تھے، جیسے ہدایہ، فتاویٰ عالمگیریہ وغیرہ۔ اب انگریز جج ان ترجمہ شدہ کتابوں کی بنیاد پر مسلمانوں کے تنازعات کا فیصلہ کرنے لگے۔ ان فیصلوں کے نتیجے میں بتدریج جو قانون وجود میں آ گیا، اسے اینگلو مجٹن لا، یا مجٹن لا، کہا جانے لگا۔ یہ اسلامی قانون کو "انگریزی لانے" کا عمل تھا۔ آج جو لوگ انگریزوں کے چھوڑے ہوئے قوانین کے "اسلامی لانے" پر اعتراض کرتے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے

³³ دیکھیے، دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی دفعہ 24۔

³⁴ فواد اسحق بنام مسماہ مہرین منصور، PLD 2020 SC 269، پیرا ۱۴۔

³⁵ تفصیل کے لیے دیکھیے:

Saqib Jawad, "Anglicization of Islamic Law in the Sub-continent and Its Impact on the Legal System of Pakistan," 'Ulum-i-Islamia 26:2 (2020), 1-16.

کہ اگر انگریزوں نے اسلامی قانون کو انگریزیانے کا عمل نہ کیا ہوتا، تو شاید آج ہمیں انگریزوں کے چھوڑے ہوئے قوانین کو اسلامیانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انگریزوں نے عائلی امور سے متعلق "قانون سازی" بہت کم کی ہے اور عام طور پر عدالتوں کے ذریعے شریعت کو انگریزیانے کا طریقہ ہی اپنائے رکھا۔ جو چند قوانین انھوں نے بنائے، ان میں ایک اہم قانون "مسلم تہنیک نکاح کا قانون ۱۹۳۹ء" تھا، جس کا ذکر اس موجودہ فیصلے میں بھی آیا ہے۔ اس قانون کے بنانے میں مسلمان علمائے کرام، بالخصوص حکیم الامت مولانا شرف علی تھانوی کا بہت اہم کردار رہا ہے جنھوں نے مسلمان خواتین کو شوہروں کے ظلم سے بچانے کے لیے مالکی مذہب پر فتویٰ دے کر اس قانون کی راہ ہموار کی اور اس کا ابتدائی مسودہ تیار کرنے میں بھی مدد کی۔³⁶

ایک اور اہم قانون، جس کا ذکر اس فیصلے میں نہیں کیا گیا، مسلم پرسنل لا (شریعت) ایپیلی کیشن ایکٹ ہے جس کی رو سے یہ قرار پایا کہ نکاح، طلاق، میراث وغیرہ سمیت متعدد موضوعات پر "اگر قانون سازی نہ کی گئی ہو، تو فیصلے کے لیے ضابطے کی حیثیت شریعت کو حاصل ہوگی۔" پاکستان میں اس وقت اس قانون کا وہ ایڈیشن رائج ہے جو بعض جزوی ترامیم کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں نافذ کیا گیا۔ اس وقت فیملی کورٹس میں تنازعات کا فیصلہ اسی قانون کی وجہ سے شریعت پر ہوتا ہے، بشرطیکہ متعلقہ موضوع پر قانون سازی نہ کی گئی ہو۔³⁷ مثلاً میراث کے متعلق پاکستان میں کوئی قانون سازی نہیں کی گئی، سوائے مسلم فیملی لاز آرڈی نینس کی دفعہ ۴ کے، جس کی رو سے یتیم پوتے پوتیوں/نواسے نواسیوں کے لیے حق وراثت تخلیق کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس مخصوص مسئلے میں عدالتیں شریعت کے بجائے اس آرڈی نینس کی دفعہ ۴ پر عمل کرتی ہیں، لیکن باپ، دادا، ماں، دادی، بیٹا، بیٹی، بھائی، بہن وغیرہ رشتہ داروں کی میراث کے متعلق بالعموم شریعت پر فیصلہ ہوتا ہے۔

یہ قانون برطانوی راج کے دور میں یوں مفید ثابت ہوا کہ بڑی حد تک مسلمانوں کا عائلی قانون شریعت کے مطابق ہی رہا۔ پاکستان بن چکنے کے بعد مسلمانوں کا اپنا تفصیلی عائلی قانون وجود میں آنا چاہیے تھا، لیکن بد قسمتی سے ابھی تک نہیں ایسا نہیں ہوا۔ ایسے میں اب بھی یہ قانون غنیمت ہے کیونکہ اس کی رو سے اب بھی عائلی امور میں بیش تر مقدمات میں فیصلہ شریعت پر ہوتا ہے۔ ۲۰۱۵ء میں اسی قانون کو بنیاد بنا کر سپریم کورٹ نے انکارِ نسب کے متعلق شریعت کے احکام کی پابندی لازمی قرار دی تھی اور شوہر کی جانب سے انکارِ نسب کے مطلق حق کو شرعی شرائط کے ساتھ مقید قرار دیا۔³⁸ اس موجودہ مقدمے میں بھی یہ اصول اسی بنا پر تسلیم کیا گیا کہ چونکہ شریعت کی رو سے مہر کی ذمہ داری شوہر پر عائد ہوتی ہے، اس لیے پاکستانی قانون میں بھی یہی پوزیشن ہے۔

³⁶ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے مولانا شرف علی تھانوی کا تفصیلی فتویٰ بعنوان: العیالہ النازحۃ للحلیۃ العاجزۃ۔

³⁷ دیکھیے مذکورہ قانون کی دفعہ ۲۔

³⁸ یہ فیصلہ جناب جسٹس جواد ایس خواجہ صاحب نے لکھا تھا۔ دیکھیے: غزالہ تحسین زہرا بنام مہر غلام دستگیر خان، PLD 2015 SC 327۔

ثانیاً: نئے اسلامی قوانین بنانے سے زیادہ اہم کام موجودہ قوانین کی اسلامی تعبیر کا ہے۔

پاکستان میں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے، تو اس کا حل نئی قانون سازی کے ذریعے تلاش کیا جاتا ہے۔ یوں پاکستان میں بعض اوقات ایک ہی موضوع پر بہت سارے قوانین کی بھرمار ہوتی ہے۔ تاہم بعض امور ایسے ہیں جن پر بہت کم قانون سازی کی گئی ہے، جیسا کہ ابھی پیچھے ذکر کیا گیا کہ پاکستان میں عائلی امور پر بہت کم قانون سازی ہوئی ہے اور قانونی نظام کے اس حصے کو بالعموم عدالتی تعبیر پر چھوڑا گیا ہے۔ کئی مسلم ممالک میں مابعد استعمار دور میں عائلی امور پر تفصیلی قانون سازی ہوئی ہے اور پاکستان میں بھی ایک فیملی لاز کے تفصیلی کوڈ کی ضرورت ہے تاکہ جج صاحبان کے تمیزی اختیارات (discretionary powers) کو محدود کیا جاسکے۔ اس پہلو پر ہمارے مذہبی حلقوں کی جانب سے بات بھی ہوتی رہتی ہے۔ تاہم جس پہلو کو نظر انداز کیا گیا ہے، وہ قوانین کی اسلامی تعبیر کا مسئلہ ہے۔

دستور کی رو سے یہ لازم ہے، جیسا کہ اس موجودہ فیصلے میں بھی کہا گیا، کہ پاکستان میں رائج موجودہ تمام قوانین شریعت سے ہم آہنگ ہوں۔³⁹ یہ ہم آہنگی کیسے یقینی بنائی جائے؟ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ ان قوانین سے وہ امور دور کر دیے جائیں جو اسلامی احکام سے متصادم ہوں۔ دفعہ ۲۲ میں اس پہلو کو الگ سے خصوصاً ذکر کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے بنیادی کردار پارلیمنٹ کا ہے جو نئے قوانین بھی وضع کر سکتی ہے اور موجودہ قوانین میں حذف و اضافہ اور ترمیم بھی کر سکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے دو مزید ادارے بھی دستور کے تحت مختلف دائروں میں کام کرتے ہیں۔ ایک ادارہ اسلامی نظریاتی کونسل ہے جو موجودہ قوانین کا جائزہ لے کر ان میں اسلامی احکام سے متصادم امور کی نشان دہی کرتی ہے اور پھر ان کے متعلق اپنی سفارشات پارلیمنٹ کو پیش کرتی ہے۔ دوسرا ادارہ وفاقی شرعی عدالت کا ہے جو موجودہ قوانین کو اسلامی احکام سے متصادم کی بنیاد پر تصادم کی حد تک کا عدم قرار دے سکتی ہے۔ ان دونوں اداروں نے اس ضمن میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ تاہم قوانین کو اسلامیانے کے عمل کا یہ محض ایک پہلو ہے۔

اتنا ہی یا شاید اس سے زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ موجودہ قوانین کی تعبیر اسلامی قانون کی روشنی میں یوں کی جائے کہ یہ اسلامی قانون سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ یہ کام ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کا ہے۔ اس پہلو کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ روزانہ کی بنیاد پر مسلسل قانون کی تعبیر کرتی رہتی ہیں اور قانون کی جو تعبیر ان عدالتوں نے متعین کی، وہی عملاً نافذ ہوتی ہے۔ چنانچہ تعبیر کے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے یہ عین ممکن ہوتا ہے کہ ایک اسلامی قانون کو سیکولر بنایا جائے، یا کسی سیکولر قانون کو اسلامی سا نچے میں ڈھالا جائے۔

مثال کے طور پر قتل سے متعلق مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعات کو ۱۹۷۹ء میں پشاور ہائی کورٹ کی شریعت بنچ نے⁴⁰ اور پھر ۱۹۸۰ء میں وفاقی شرعی عدالت نے اسلامی احکام سے متصادم قرار دیا۔⁴¹ اس کے بعد ۱۹۸۹ء میں سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بنچ نے ان دونوں فیصلوں کی اپیلوں

³⁹ دیکھیے دستور کی دفعہ ۲۲۔

⁴⁰ گل حسن بنام وفاق پاکستان، 1-PLD 1980 PHC۔

⁴¹ محمد ریاض بنام وفاق پاکستان، 1-PLD 1980 FSC۔

پر فیصلہ سناتے ہوئے ان دفعات کی غیر اسلامی حیثیت پر مہر ثبت کر دی اور حکومت کو حکم دیا کہ ان کی جگہ اسلامی احکام پر مبنی نیا قانون لائے۔⁴² مثال مٹول کے بعد پہلے ۱۹۹۰ء میں حکومت قصاص و دیت کا قانون آرڈی نینس کی صورت میں لائی۔ سات سال تک یہ قانون آرڈی نینس کی صورت میں ہی نافذ کیا جاتا رہا کیونکہ پارلیمنٹ اسے ایکٹ کی صورت میں منظور نہیں کر رہی تھی۔ بالآخر ۱۹۹۷ء میں پارلیمنٹ نے اسے منظور کیا۔ بعض جزوی ترامیم کے ساتھ یہی قانون اس وقت بھی پاکستان میں رائج ہے۔ تاہم قانون سازی کے بعد جب بات قانون کے نفاذ کی طرف آئی تو اب معاملہ شریعت، پنج، شرعی عدالت اور شریعت اپیلیٹ پنج کے بجائے ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کے دائرہ اختیار میں آیا کیونکہ قانون کی تعبیر انھی کا کام تھا۔ اس قانون کی تعبیر کے متعلق سپریم کورٹ کے اہم نظائر کے تفصیلی تجزیے کے بعد میری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ اب قانون عملاً اسی صورت میں نافذ ہے جس میں وہ ۱۹۷۹ء میں تھا اور مختلف جج صاحبان نے متعدد فیصلوں میں اس قانون کی دفعات کا ایسا مفہوم متعین کیا ہے کہ یہ اسلامی قانون سیکولر ہو گیا ہے!⁴³ اس عمومی کلیہ سے بہت کم استثناءات ہیں اور ان استثناءات میں ایک جناب جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب ہیں جو اپنے تقریباً ہر فیصلے میں کوشش کرتے ہیں کہ اس قانون کی تعبیر اسلامی احکام کی روشنی میں کی جائے۔⁴⁴

واضح رہے کہ یہ معاملہ صرف قصاص و دیت کے قانون کا نہیں ہے بلکہ قانون نفاذ شریعت ۱۹۹۱ء کے تحت تمام عدالتوں پر لازم ہے کہ ہر قانون کی ایسی تعبیر اختیار کریں جو اسلامی احکام کے مطابق ہو۔⁴⁵ بد قسمتی سے اس قانون پر عمل نہ ہونے کے برابر ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وکیل ہوں یا جج، اسلامی احکام اور اصولوں میں ان کی تربیت ہی نہیں ہوتی۔ بہت کم وکیل ایسے ہوتے ہیں جو اسلامی احکام کی روشنی میں اپنے دلائل پیش کریں اور بہت کم جج ایسے ہوتے ہیں جو اسلامی احکام کے مطابق قانون کی تعبیر کا بھاری پتھر اٹھا سکیں۔ ایسے میں جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب یقیناً ایک روشن مثال کی حیثیت رکھتے ہیں جو یہ ذمہ داری پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ موجودہ کیس اس کوشش کی ایک بہترین مثال ہے۔

ایک جزوی اختلاف

آخر میں ہم فیصلے میں مذکور ایک obiter dictum، یعنی ایسا ریمارک جو جج نے چلتے چلتے دیا ہو لیکن جس سے فیصلے پر اثر نہ پڑتا ہو، کے متعلق اپنا جزوی اختلاف بھی ذکر کرنا چاہیں گے۔

⁴² - وفاق پاکستان بنام گل حسن و دیگر، PLD 1989 SC 633۔

⁴³ - مثال کے طور پر دیکھیے: زاہد رحمان بنام ریاست، PLD 2015 SC 77۔

⁴⁴ - کیا مقتول کے ورثا کی جانب سے معافی یا صلح کے بعد قاتل کی صرف سزا ختم ہو جاتی ہے یا اس کا جرم بھی محو ہو جاتا ہے؟ اس سوال پر سپریم کورٹ کے مختلف پنج نے مختلف فیصلے سنائے ہیں۔ جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب نے کئی فیصلوں میں قرار دیا ہے کہ اس سے صرف سزا ختم ہو جاتی ہے اور جرم کا محو ہونا لازمی نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بنیادی طور پر قرآن و سنت کی نصوص سے استدلال کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

Muhammad Munir, "Does A Compromise Blot Out Guilt and Punishment? Analyzing Qisas and Diyat Provisions of Criminal Law in Pakistan under the Injunctions of Islam," *Islamic Studies* 59:1 (2020), 9-28.

⁴⁵ - دیکھیے مذکورہ قانون کی دفعہ ۴۔

عزت مآب جسٹس فائز عیسیٰ صاحب نے خواتین کے حقوق کے تحفظ کے ضمن میں شرعی احکام ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ بیوی کے حق میں وصیت کی ترغیب دی گئی ہے، اور اس کے لیے دلیل کے طور پر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۴۰ کا حوالہ دیا ہے۔⁴⁶

بہ صد احترام عرض ہے کہ ہماری ناقص رائے میں یہ استدلال درست نہیں ہے۔

وصیت کے احکام ابتدائی دور میں دیے گئے جب ابھی مسلمانوں کا معاشرہ تشکیلی دور میں تھا۔ چنانچہ ابتدا میں والدین اور دیگر رشتہ داروں کے لیے وصیت فرض کی گئی۔⁴⁷ اسی طرح کہا گیا کہ بیوہ کے لیے ایک سال کے متاع اور گھر سے نہ نکالنے کی وصیت کریں۔⁴⁸ تاہم غزوہ احد کے بعد جب وراثت کے احکام سورۃ النساء میں نازل کیے گئے تو ان میں والدین اور دیگر رشتہ داروں سمیت بیوہ کے لیے بھی وراثت میں باقاعدہ حصہ مقرر کیا گیا (چوتھا حصہ، اگر میت کی اولاد نہ ہو، اور آٹھواں حصہ، اگر میت کی اولاد ہو)۔⁴⁹ پھر رسول اللہ ﷺ نے صریح حکم بیان فرمایا کہ اللہ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا، چنانچہ اب وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جاسکتی۔⁵⁰

البتہ بیوہ کے لیے عدت کا حکم جو ابتدا میں چار ماہ دس دن تھا،⁵¹ وہ برقرار رہا جس میں جزوی تبدیلی سورۃ الطلاق کے نزول کے بعد ہوئی جب اس میں قرار دیا گیا کہ حاملہ خواتین کی عدت وضع حمل تک ہے۔ یہ مدت چار ماہ دس دن سے کم بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ بھی۔⁵² اسی طرح شوہر نے اگر بیوی کو طلاق دے دی، تو اس صورت میں بھی مطلقہ کے لیے عدت کا حکم برقرار رہا جو تین حیض ہیں،⁵³ یا اگر وہ حاملہ ہو تو کی رو سے وضع حمل تک ہے،⁵⁴ اور اگر اسے حیض نہ آتا ہو اور وہ حاملہ بھی نہ ہو، تو پھر یہ مدت تین قمری مہینے ہے۔⁵⁵ اس مدت میں خاتون کو اس گھر میں رہنے کا حق حاصل ہے، خواہ

46- فواد الحق بنام مسماۃ مہرین منصور، PLD 2020 SC 269، پیرا ۱۲۱۔

47- القرآن، ۲: ۱۸۰۔

48- القرآن، ۲: ۲۴۰۔

49- آقرآن، ۲: ۷۷-۱۷۸ اور ۲: ۱۷۸۔

50- سنن ابی داؤد، کتاب الوصایا، باب ماجاء فی الوصیۃ لوارث۔

51- القرآن، ۲: ۲۳۴۔

52- دیکھیے سورۃ الطلاق کی آیات ۴ اور ۶۔ یہ موقف حنفی فقہائے کرام کا ہے۔ بعض دیگر فقہائے کرام نے جمع کی راہ اختیار کرتے ہوئے قرار دیا ہے کہ ان دونوں مدتوں میں جو زیادہ ہو، اسی کو عدت سمجھا جائے گا۔

53- القرآن، ۲: ۲۲۸۔ یہ بھی حنفی فقہائے کرام کا موقف ہے جو "قرء" سے حیض مراد لیتے ہیں۔ شافعی فقہائے کرام اس سے طہر مراد لیتے ہیں۔

54- القرآن، ۲: ۲۴۵ اور ۲: ۲۴۵۔

55- القرآن، ۲: ۲۴۵۔

عدت وفات کی صورت میں ہو یا طلاق کی صورت میں اور خواہ تین طلاقیں دی گئی ہوں، جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا تھا۔ اسی طرح عدت کے دوران میں اس خاتون پر اٹھنے والا خرچہ شوہر کے ذمے ہوتا ہے۔⁵⁶

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ بیوی کے لیے وصیت والا حکم عبوری دور کے لیے تھا جس کے بدل کے طور پر بعد میں تفصیلی نظام دے دیا گیا۔

شاید جسٹس صاحب نسخ قرآن کے مسئلے میں ان اہل علم کی رائے کو درست مانتے ہوں جن کے نزدیک قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ نسخ کا لفظ ویسے بھی بہت بھاری محسوس ہوتا ہے اور یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ہر ظاہری تعارض کی صورت میں فوراً ہی نسخ کی طرف لپکنا نہیں چاہیے بلکہ رفع تعارض کے لیے جو محکم اہل علم نے ذکر کیے ہیں، ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ نیز نسخ اور تخصیص کا فرق بھی ملحوظ نظر رکھنا چاہیے۔ تاہم فقہائے کرام نے جس طرح نسخ کے تصور کی وضاحت کی ہے، اس کے بعد اس کی قبولیت میں کوئی چیز مانع نہیں رہتی اور اسے قبول کرنے کے بعد مختلف آیات کی تاویل میں آدمی اس طرح کے بے جا تکلف سے بچ جاتا ہے جس میں عدم نسخ کے قائلین مبتلا نظر آتے ہیں۔

نتائج بحث

شادی شدہ خواتین کے حق ملکیت کے متعلق یہ فیصلہ نہایت دور رس نتائج کا حامل ہے۔ اس سے نہ صرف مال و جائیداد کی ملکیت کے متعلق شادی شدہ خواتین کے حقوق کا تحفظ ممکن ہو سکے گا، بلکہ اس کے اثرات پاکستان میں قوانین کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ بنانے کے عمل پر بھی مرتب ہوں گے۔ اس فیصلے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر اعلیٰ عدلیہ کے جج صاحبان قرآن و سنت کی نصوص اور اسلامی قانون کے اصولوں کی رو سے تعبیر کی راہ اختیار کریں، جیسا کہ پاکستان کے دستور اور قانون کا ان سے تقاضا ہے، تو خواتین اور دیگر کمزور طبقات کے حقوق کا بہتر طریقے سے تحفظ ہو سکے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جج صاحبان اور قانون دانوں کی توجہ قانون سازی کے علاوہ قانون کی اسلامی تعبیر کی طرف مبذول کرانے کے لیے اہل علم اپنا کردار ادا کریں۔

⁵⁶ مزید یہ کہ حنفی فقہ کی رو سے اگر نکاح فاسد بھی ہو لیکن اس کے بعد دخول ہوا ہو، تو عورت پر عدت ہوتی ہے لیکن اس عدت کی مدت کم ہوتی ہے۔ اسی طرح شیعہ اثنا عشری فقہ کی رو سے متعہ کے بعد بھی عدت ہوتی ہے۔ اسی طرح اپنی زندگی میں شوہر اپنی بیوی کو بہت کچھ ہبہ کر سکتا ہے اور بیوی اس کی مالک ہوگی اگر اسے قبضہ بھی دے دیا گیا ہو۔ نیز بہت سی صورتوں میں یہ ہبہ ناقابل واپسی بھی ہو جاتا ہے، یعنی شوہر اس سے رجوع نہیں کر سکے گا۔ البتہ اگر ہبہ مرض الموت میں کیا جائے تو اس پر وصیت کے احکام کا اطلاق ہوتا ہے۔